ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 433

Program: B.A

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: اقبال کی فارسی شاعری (433) • سطح: بی۔اے

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ: 5 تا 8)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 40

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

USMAN NOTES www.usmannotes.com

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1: مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب (20 نمبر)

سوال نمبر 1: (الف) مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے۔ (20)

تعارف

اس سوال کے مختصر سوالات یونٹ پانچ تا آٹھ کے اہم فکری و ادبی نکات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان میں اقبال کے اشعار کی تشریح، فارسی غزل کی روایت، خودی و عشق کے تصورات، قرآنی حوالے اور اقبال کے اسلوب جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ہر جواب مختصر مگر وضاحت کے ساتھ دیا گیا ہے تاکہ طالب علم صرف جواب یاد نہ کرے بلکہ اس کا

پس منظر بھی سمجھے۔ یہ سوالات اس بات کی تربیت بھی دیتے ہیں کہ اقبال کے فارسی اشعار کو پڑھتے وقت لفظ، علامت اور فکر تینوں پر نظر رکھنی چاہیے، کیونکہ اقبال کے ہاں ہر علامت کسی نہ کسی فکری تصور کی نمائندہ ہے۔

1۔ "اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر / معنیِ ذبحِ عظیم آمد پسر" میں کن شخصیات کی طرف اشارہ ہے؟

اس شعر میں "بائے بسم اللہ پدر" سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور "معنیِ ذبحِ عظیم آمد پسر" سے مراد ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ اقبال نے اس شعر میں باپ بیٹے کی اس عظیم قربانی کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں باپ حکمِ الٰہی پر بیٹے کو قربان کرنے کو تیار ہوا اور بیٹا رضائے الٰہی پر سر جھکانے کو آمادہ ہوا۔ یہ شعر دراصل اطاعت، ایثار اور عشقِ الٰہی کی اس معراج کی علامت ہے جسے اقبال مردِ مومن کے لیے نمونہ قرار دیتے ہیں۔

2۔ فارسی غزل میں سب سے اعلیٰ مقام کس شاعر کو دیا جاتا ہے؟

فارسی غزل میں سب سے اعلیٰ مقام خواجہ حافظ شیرازی کو دیا جاتا ہے۔ حافظ نے غزل کو لفظ و معنی، کیف و سرور اور موسیقیت کے اس مقام تک پہنچایا کہ ان کا دیوان فارسی ادب کا شاہکار قرار پایا۔ ان کے اشعار میں دنیوی حسن کے ساتھ عرفانی گہرائی بھی ہے، اسی لیے ان کا کلام ہر طبقے میں مقبول ہوا۔ اقبال حافظ کے فنی کمال کے معترف تھے، اگرچہ فکری سطح پر انہوں نے حافظ کے بعض مائل بہ جمود تصورات پر تنقید بھی کی ہے۔

3۔ اقبال نے کس کتاب کے بارے میں خواہش ظاہر کی کہ کاش یہ کتاب گوئٹے نے پڑھی ہوتی؟

اقبال نے اپنی فارسی کتاب "پیامِ مشرق" کے بارے میں خواہش ظاہر کی تھی کہ کاش یہ کتاب جرمن شاعر گوئٹے نے پڑھی ہوتی۔ پیامِ مشرق دراصل گوئٹے کے "مغربی دیوان" کے جواب میں لکھی گئی تھی، جس میں گوئٹے نے مشرق، خصوصاً حافظ، سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ اقبال چاہتے تھے کہ گوئٹے دیکھے کہ مشرق نے اس کے پیغام کا جواب کس شان سے دیا ہے۔ یہ خواہش اقبال کے اس اعتماد کی علامت ہے کہ مشرق کے پاس مغرب کو دینے کے لیے روحانی و فکری دولت موجود ہے۔

4۔اقبال کے ہاں کبوتر کس چیز کی علامت ہے؟

اقبال کے ہاں کبوتر آسائش پسندی، بزدلی اور غلامانہ ذہنیت کی علامت ہے۔ کبوتر گھر کا پرندہ ہے، وہ بلندی پر اڑنے اور خطرہ مول لینے کے بجائے محفوظ گوشے اور دانے دنکے پر قناعت کرتا ہے۔ اقبال اسے شاہین کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں؛ شاہین آزادی، خودداری اور بلند پروازی کی علامت ہے جبکہ کبوتر اس انسان کی تمثیل ہے جو جدوجہد سے گھبراتا اور دوسروں کے رحم و کرم پر جیتا ہے۔ اقبال نوجوان کو کبوتر بننے کے بجائے شاہین بننے کی تلقین کرتے ہیں۔

5۔اقبال مردِ مومن میں کس قسم کی صفات دیکھنا چاہتے ہیں؟

اقبال مردِ مومن میں خودی کی پختگی، عشقِ الٰہی و عشقِ رسول، فقر و استغنا، جرات و شجاعت، نرمی کے ساتھ سختی اور علم کے ساتھ عمل جیسی صفات دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا مردِ مومن ہوائے نفس کا غلام نہیں ہوتا؛ وہ نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو ہوتا ہے، رزم میں فولاد اور بزم میں ریشم کی مانند ہوتا ہے۔ وہ زمانے سے کٹ کر نہیں رہتا بلکہ دنیا میں رہ کر اس کی تعمیر کرتا ہے۔ یہی صفات مل کر اقبال کے انسانِ کامل کا نقشہ بناتی ہیں۔

6۔اقبال نے کس تہذیب کو فتنہ کہا ہے؟

اقبال نے مغرب کی مادہ پرست تہذیبِ حاضر کو فتنہ کہا ہے۔ ان کے نزدیک یہ تہذیب بظاہر بڑی پرشکوہ ہے، مگر اس کی بنیاد روحانیت کے انکار، مادے کی پرستش اور اخلاق کی پامالی پر ہے، اس لیے یہ انسانیت کے لیے امن کے بجائے تباہی کا باعث بنی ہے۔ اقبال مغرب کی سائنس و صنعت کے مخالف نہیں تھے؛ ان کی تنقید اس تہذیبی فلسفے پر ہے جو انسان کو محض معاشی حیوان بنا دیتا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ اس فتنے کی چمک سے دھوکا نہ کھائیں اور اپنی روحانی اساس کی حفاظت کریں۔

7۔قرآن میں حضرت سلیمان و بلقیس کے قصے کے پردے میں کس کی مذمت کی گئی ہے؟

قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ بلقیس کے قصے کے پردے میں خود غرض، خدا فراموش حکمرانی اور استبدادی ملوکیت کے رویے کی مذمت سمجھی جاتی ہے، جس میں حکمران قوم کو اپنی رعایا سمجھ کر اس کی آزادی سلب کر لیتا ہے۔ اقبال نے اس قصے سے یہ سبق اخذ کیا ہے کہ اصل بادشاہی اللہ کی اطاعت اور عدل میں ہے، نہ کہ جبر و

تکبر میں۔ اسی لیے انہوں نے ملوکیت کو اسلام کی روح کے منافی قرار دیا اور اس سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ قصے کا اصل درس یہ ہے کہ طاقت جب ایمان کے تابع ہو تو رحمت بنتی ہے، ورنہ فتنہ بن جاتی ہے۔

8۔ اقبال عشق میں فراق و وصال میں سے کس فلسفے کے حامی ہیں؟

اقبال عشق میں فراق، یعنی جدائی و جستجو، کے فلسفے کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک وصال میں جستجو ختم ہو جاتی ہے اور زندگی کا اصل لطف اسی تڑپ اور تلاش میں ہے جو عاشق کو ہمیشہ سرگرم رکھتی ہے۔ فراق عاشق کی خودی کو مضبوط کرتا ہے جبکہ وصالِ کامل کی آسائش اسے سست بنا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال زندگی کو مسلسل حرکت سمجھتے ہیں اور منزل پر ٹھہر جانے کو موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں عشق کا کمال یہ ہے کہ محبوب سے قرب کی خواہش کبھی ختم نہ ہو اور انسان ہمیشہ آگے بڑھتا رہے۔

9۔ "بہ جبریلِ امیں ہم داستانم / رقیب و قاصد و دربان ندانم" اقبال نے کس کے متعلق کہا ہے؟

یہ شعر اقبال نے انسان، خصوصاً مردِ مومن و انسانِ کامل، کے مقام کے متعلق کہا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جب انسان عشق و خودی کے مقام پر پہنچتا ہے تو جبریلِ امیں جیسی عظیم ہستی بھی اس کی رفیق و ہم داستان بن جاتی ہے؛ وہ اسے رقیب، قاصد یا دربان نہیں سمجھتا۔ یہ شعر اقبال کے تصورِ عظمتِ آدم کی ترجمانی کرتا ہے کہ انسان کی پرواز فرشتوں کی پرواز سے آگے جا سکتی ہے۔ اس سے مراد گستاخی نہیں، بلکہ اس مقام کا بیان ہے جو اللہ نے انسان کو عطا کیا ہے۔

10۔ اقبال نے محرمِ رازِ درونِ مے خانہ کسے کہا ہے؟

اقبال نے مولانا جلال الدین رومی کو محرمِ رازِ درونِ مے خانہ کہا ہے۔ مے خانہ یہاں روحانی معرفت و عشق کی دنیا کا استعارہ ہے اور اس کے رازوں سے واقف ہستی رومی ہیں، جن کی مثنوی کو اقبال عشق و معرفت کا سمندر سمجھتے تھے۔ اقبال نے رومی کو اپنا مرشد تسلیم کیا اور کہا کہ وہ رومی کے فیض سے ہی فارسی شاعری اور فلسفۂ خودی کی راہوں سے آشنا ہوئے۔ جاوید نامہ میں رومی کا بطور راہ نما آنا اسی تعلق کا عملی اظہار ہے۔

11۔اقبال کے بقول عروجِ آدمِ خاکی سے ستارے خوف زدہ کیوں ہیں؟

اقبال کے بقول عروجِ آدمِ خاکی سے ستارے اس لیے خوف زدہ ہیں کہ انسان میں کائنات کو تسخیر کرنے اور اس کے اسرار کو کھولنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ ان کا مشہور مصرع ہے کہ عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے۔ انسان اگر اپنی خودی کو بیدار کر لے تو وہ فطرت کی قوتوں کا غلام نہیں رہتا بلکہ ان کا حاکم بن جاتا ہے۔ ستاروں کا خوف دراصل اسی انقلابی صلاحیت کی تمثیل ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے۔

12۔ستاروں پر کمندیں ڈالنا کس جذبے کا اظہار ہے؟

ستاروں پر کمندیں ڈالنا بلند ہمتی، جستجو اور تسخیرِ کائنات کے جذبے کا اظہار ہے۔ اس سے مراد وہ حوصلہ ہے جو ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے انسان کو آمادہ کرتا ہے اور اسے موجودہ حالت پر قناعت نہیں کرنے دیتا۔ اقبال نوجوان کو یہی درس دیتے ہیں کہ وہ چھوٹے مقاصد پر راضی نہ ہو، بلکہ بڑے نصب العین رکھے اور ان کے لیے جدوجہد کرے۔ یہ جذبہ اقبال کی فکر میں حرکت و عمل کی بنیاد ہے اور اس کے بغیر خودی کی تکمیل ممکن نہیں۔

13۔اقبال خواجہ حافظ کی شاعری کے کس پہلو سے متاثر تھے؟

اقبال خواجہ حافظ کی شاعری کے غنائی پہلو، یعنی اس کی موسیقیت، ترنم، کیف و سرور اور لفظوں کے حسنِ آہنگ سے متاثر تھے۔ حافظ کے اشعار میں جو روانی اور دل نشینی ہے، اس کا اعتراف اقبال نے بار بار کیا ہے اور ان کی اپنی غزلوں میں بھی یہ رنگ نمایاں ہے۔ البتہ فکری اعتبار سے اقبال حافظ کے اس رجحان کے ناقد تھے جو انسان کو جمود اور بے عملی کی طرف لے جاتا ہے۔ یوں اقبال نے حافظ کے فن کو لیا اور اس میں اپنی فکر کا پیغام شامل کر کے غزل کو نئی زندگی دی۔

14۔ قرآن کریم کی کون سی سورت میں شاعروں کی مذمت ہے؟

قرآن کریم کی سورۃ الشعراء میں ان شاعروں کی مذمت کی گئی ہے جو کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں اور بے مقصد باتوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اسی سورت میں ایمان لانے والے، نیک عمل کرنے والے اور اللہ کا ذکر کرنے والے شاعروں کو اس مذمت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اقبال کے لیے یہ استثنا بڑا اہم ہے، کیونکہ ان کی شاعری کا مقصد ہی ایمان، عمل اور ذکرِ الٰہی کی دعوت ہے۔ یہ حوالہ سمجھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام شاعری کے خلاف نہیں، بے مقصد شاعری کے خلاف ہے۔

15۔ اقبال کی فکر کا کلیدی لفظ کون سا ہے؟

اقبال کی فکر کا کلیدی لفظ "خودی" ہے۔ خودی سے مراد انسان کی اپنی حقیقت، اس کا شعورِ ذات اور اس کی روحانی و انفرادی قوت ہے جسے پروان چڑھا کر وہ انسانِ کامل بنتا ہے۔ اقبال کا پورا فلسفہ اسی لفظ کے گرد گھومتا ہے؛ اسرارِ خودی میں خودی کی تعمیر اور رموزِ بے خودی میں اس کا ملت کے ساتھ تعلق بیان کیا ہے۔ خودی کی مضبوطی غرور نہیں، بلکہ اپنی ذمہ داری کا احساس ہے، اور اسی سے عشق، عمل اور آزادی جیسے تمام تصورات جنم لیتے ہیں۔

16۔ شاعری میں اقبال کے اسلوب کو کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

شاعری میں اقبال کے اسلوب کو خطیبانہ و مردانہ اسلوب کہا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں نسوانی نرمی و نازکی کے بجائے جلال، جوش، للکار اور پیغام کی شدت ہے۔ وہ قاری کو محظوظ کرنے کے بجائے جھنجھوڑتے ہیں، اس لیے ان کے اسلوب میں مبلغ و مصلح کی آواز نمایاں ہے۔ اس کے ساتھ ان کے اسلوب میں فلسفیانہ گہرائی، قرآنی اشارات اور نئی تراکیب سازی بھی شامل ہے۔ یہی امتزاج اقبال کو روایتی شعراء سے الگ کرتا ہے اور ان کی شاعری کو خطاب و تحریک کی قوت عطا کرتا ہے۔

17۔اقبال نے اپنی کس کتاب کو خلوت میں پڑھنے کی تاکید کی ہے؟

اقبال نے اپنی مثنوی "اسرارِ خودی" (اسرار و رموز) کو خلوت میں غور و فکر کے ساتھ پڑھنے کی تاکید کی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب خود شناسی کی کتاب ہے اور خود شناسی کا عمل شور و ہنگامے میں نہیں، تنہائی و توجہ میں ہوتا ہے۔ اسرارِ خودی کا مطالعہ قاری سے سوال کرتا ہے کہ وہ کون ہے اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؛ ایسے سوالات کا جواب خلوت ہی میں ملتا ہے۔اقبال چاہتے تھے کہ قاری اس کتاب کو محض شاعری سمجھ کر نہ پڑھے بلکہ اپنے باطن کا جائزہ لیتے ہوئے پڑھے۔

18۔فارسی غزل کی ابتدا کس زمانے میں ہوئی؟

فارسی غزل کی ابتدا سامانی عہد میں ہوئی، جب فارسی شاعری رودکی جیسے شعراء کے ہاتھوں پروان چڑھ رہی تھی۔ابتدائی دور میں غزل قصیدے کے تشبیبی حصے سے الگ ہو کر ایک مستقل صنف بنی اور پھر سنائی، عطار اور رومی کے ہاتھوں اسے عرفانی رنگ ملا۔بعد میں سعدی نے اسے کمالِ حسن دیا اور حافظ نے اسے معراج تک پہنچایا۔اقبال اسی ہزار سالہ روایت کے وارث ہیں اور انہوں نے اس روایت میں فکری پیغام کا اضافہ کر کے اسے جدید دور سے ہم آہنگ کیا۔

19۔کائنات کس قسم کے لوگوں کے لیے قید خانہ ہے؟

کائنات ان لوگوں کے لیے قید خانہ ہے جو بے خود، غافل اور بزدل ہیں اور جو اپنی خودی کو بیدار نہیں کرتے۔اقبال کے نزدیک کائنات بذاتِ خود قید نہیں؛ جو انسان تسخیرِ فطرت کا حوصلہ رکھتا ہے، اس کے لیے یہی کائنات وسعت و آزادی کا میدان ہے، مگر جو اسباب کے آگے سر جھکا کر بیٹھ جاتا ہے، اسے ہر چیز زنجیر محسوس ہوتی ہے۔یہ تصور اقبال کے اس اصول کا اظہار ہے کہ حالات انسان کو نہیں بناتے، انسان کا باطن حالات کی تعبیر طے کرتا ہے۔مردِ مومن کے لیے دنیا قید خانہ نہیں، عمل کا میدان ہے۔

20۔ساحل، گرداب اور نہنگ میں کون سی صنعت پائی جاتی ہے؟

ساحل، گرداب اور نہنگ تینوں کا تعلق دریا و سمندر سے ہے، اس لیے ان الفاظ میں صنعتِ مراعات النظیر پائی جاتی ہے، یعنی ایک ہی میدان سے تعلق رکھنے والے الفاظ کو ایک ساتھ لانا۔ یہ صنعت کلام میں حسن و تناسب پیدا کرتی ہے اور منظر کو مکمل صورت میں سامنے لاتی ہے۔ اقبال کے کلام میں مراعات النظیر کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، کیونکہ وہ علامتی نظام بناتے ہیں؛ ساحل سکون و جمود، گرداب خطرہ و حرکت اور نہنگ قوت و ہیبت کی علامت بن جاتے ہیں۔ یوں ایک لسانی صنعت فکری معنی بھی پیدا کرتی ہے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ان مختصر جوابوں سے اقبال کی فکر کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ مرکز خودی ہے، رفعتِ مشق ہے، نمونہ مردِ مومن ہے اور افق تسخیرِ کائنات ہے۔ فارسی غزل کی روایت، حافظ و رومی سے اقبال کا تعلق اور قرآنی حوالے اس نقشے کو تاریخی و دینی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ طالب علم اگر ان نکات کو اشعار و علامات کے ساتھ جوڑ کر یاد کرے تو اسائنمنٹ کے آگے آنے والے تفصیلی سوالات — شاہین و چکور، غزلوں کا فکری تجزیہ اور ارمغانِ حجاز کا تعارف — اس کے لیے سہل ہو جائیں گے، کیونکہ ان سب کی جڑیں انہی بنیادی تصورات میں ہیں۔

سوال نمبر 2 (الف): شاہین اور چکور — درسِ بے داری (10+10=20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ (الف) درج ذیل موضوعات پر اقبال کی اردو و فارسی شاعری کے مترادف اشعار کے حوالے سے نوٹ تحریر کیجیے۔ (10+10=20) (I) شاہین اور چکور

(II) درسِ بے داری

تعارف

اقبال کی شاعری علامات کی شاعری ہے۔ وہ اپنے فکری تصورات کو پرندوں، مناظر اور کرداروں کی تمثیل میں پیش کرتے ہیں تاکہ خشک فلسفہ زندہ صورت اختیار کر لے۔ شاہین اور چکور کا تقابل اور درسِ بے داری اسی علامتی نظام کے دو اہم موضوعات ہیں۔ شاہین اقبال کے مردِ مومن اور نوجوانِ خوددار کی علامت ہے، جبکہ چکور آسودگی و قناعت کی محدود دنیا کی تمثیل ہے۔ اسی طرح بے داری اقبال کے ہاں غفلت کی نیند سے بیدار ہونے اور خودی کو جگانے کا نام ہے۔ ذیل میں دونوں موضوعات پر اردو و فارسی شاعری کے ہم معنی اشعار و تصورات کے حوالے سے نوٹ پیش کیا جاتا ہے۔

(I) شاہین اور چکور

اقبال نے شاہین کو اپنی شاعری کی سب سے محبوب علامت بنایا ہے۔ شاہین بلند پرواز ہے، وہ آشیانہ نہیں بناتا، دوسرے کا مارا شکار نہیں کھاتا، وہ تنہا رہنا پسند کرتا ہے اور اس کی نگاہ ہمیشہ بلندی کی طرف رہتی ہے۔ یہی اوصاف اقبال نوجوان اور مردِ مومن میں دیکھنا چاہتے ہیں: آزادی، خودداری، محنت کی کمائی اور بلند مقصد۔ اقبال کا مشہور شعر ہے کہ تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا، تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں۔ فارسی کلام میں بھی عقاب و شاہین کی یہی تصویر خودی کی بلندی اور ترکِ آسائش کے مفہوم میں آتی ہے، جہاں اقبال زمین کی پستیوں سے گھبرا کر فضا کی وسعتوں کو اپنا مسکن بنانے کی تلقین کرتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں چکور وہ پرندہ ہے جو چاند کی روشنی پر فریفتہ اور اپنی محدود دنیا میں مگن رہتا ہے۔ ادبی روایت میں چکور کو چاند کا عاشق کہا جاتا ہے، مگر اقبال کے علامتی نظام میں اس کا تقابل شاہین سے اس نکتے کو واضح کرتا ہے کہ محض حسن پر فریفتہ ہونا اور آسائش میں کھو جانا زندگی نہیں۔ جو نوجوان شاہین کے بجائے چکور کی سی زندگی اختیار کرتا ہے، وہ بلند مقاصد کے بجائے چھوٹی خوشیوں پر قناعت کر لیتا ہے۔ اقبال کا مقصد پرندوں کی ماہیت بیان کرنا نہیں، بلکہ دو طرزِ زندگی کا فرق واضح کرنا ہے: ایک زندگی حرکت، آزادی اور خودی کی ہے، دوسری جمود، تقلید اور تساہل کی۔ اردو نظم "ایک پہاڑ اور گلہری" سے لے کر "شاہین" تک اور فارسی غزلوں کے عقاب و باز کے اشعار تک، یہی تقابل مختلف صورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔

جدول: شاہین اور چکور کا علامتی موازنہ

چکور	شاہین	علامت
محدود دنیا میں مگن، روشنی پر فریفتگی	بلند پروازی، تنہائی پسندی، آشیانہ سازی سے گریز	طرزِ زندگی
موجود پر قناعت، جستجو سے گریز	اپنے شکار پر گہری خودداری	رزق
آسائش پسند، کم ہمت، جمود کا شکار انسان	مردِ مومن، خود دار، آزادی و حرکت	انسانی مفہوم
چکور کی سی قناعت کو زندگی نہ سمجھو	شاہین بنو، مقصد بلند رکھو	اقبال کا پیغام

(II) درسِ بے داری

درسِ بے داری اقبال کی شاعری کا دوسرا بڑا موضوع ہے۔ بے داری سے مراد صرف جاگنا نہیں، بلکہ خودی کا بیدار ہونا، حالات کا شعور حاصل کرنا اور غفلت کی اس نیند سے نکلنا ہے جس نے ملت کو عمل سے محروم کر دیا ہے۔ اقبال نے اردو میں "خضرِ راہ"، "طلوعِ اسلام" اور "شکوہ و جوابِ شکوہ" جیسی نظموں میں اور فارسی میں پیامِ مشرق و جاوید نامہ میں بار بار یہ صدا لگائی ہے کہ مسلمان کی اصل بیماری اس کی غفلت ہے۔ ان کا مشہور تصور ہے کہ قومیں خوابِ غفلت میں مٹ جاتی ہیں اور بیداری ہی زندگی کی علامت ہے۔ فارسی اشعار میں بھی وہ صبح، سحر اور بیداری کو نئی زندگی کے استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور نوجوان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ رات گزر چکی، اب عمل کا وقت ہے۔

درسِ بے داری کے تین پہلو خاص طور پر نمایاں ہیں۔ پہلا پہلو خود شناسی ہے: انسان پہلے اپنے آپ کو پہچانے کہ وہ کون ہے اور کس مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے۔ دوسرا پہلو زمانہ شناسی ہے: بیدار انسان اپنے دور کے تقاضوں، دشمن کی چالوں اور اپنی کمزوریوں کو کھلی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ تیسرا پہلو عمل ہے: بیداری اگر عمل میں نہ ڈھلے تو وہ محض بے چینی بن کر رہ جاتی ہے۔ اقبال کے ہاں بیداری کا یہ درس انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی؛ فرد بیدار ہو تو ملت بیدار ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری کو بیداری کی شاعری کہا جاتا

ہے۔ طالب علم کے لیے اس موضوع کا سبق یہ ہے کہ اقبال کی علامتیں، خواہ شاہین ہو یا سحر، سب اسی ایک مرکز کے گرد گھومتی ہیں کہ مسلمان اپنے آپ کو پہچانے اور غفلت چھوڑ کر میدانِ عمل میں آئے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ شاہین و چکور کا تقابل دو طرزِ زندگی کا فرق ہے اور درس بے داری اس زندگی کو اختیار کرنے کی دعوت ہے جو شاہین کی سی ہے۔ اقبال کی اردو و فارسی شاعری میں یہ موضوعات ہم معنی اشعار و علامات کے ساتھ بار بار آتے ہیں، کیونکہ ان کی پوری فکر کا خلاصہ یہی ہے کہ خودی بیدار ہو اور انسان آسائش کے بجائے حرکت کو اپنائے۔ جو قاری ان علامات کو سمجھ لے، وہ اقبال کے باقی کلام کو بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے، کیونکہ یہ علامتیں دراصل اقبال کے فلسفے کی کنجیاں ہیں۔

اس موضوع کو مزید گہرائی سے سمجھنے کے لیے یہ بات نوٹ کرنی چاہیے کہ اقبال کی علامتیں ہر جگہ ایک ہی مفہوم نہیں رکھتیں، بلکہ سیاق و سباق کے ساتھ ان کے رنگ بدلتے ہیں۔ شاہین ہمیشہ تعریف ہی کے لیے آتا ہے، مگر ساحل و موج، صبح و شام اور خودی و بے خودی جیسی علامتیں مختلف نظموں میں مختلف زاویے پیش کرتی ہیں۔ بے داری کا درس بھی محض سیاسی نعرہ نہیں؛ اس کی پہلی منزل باطنی بیداری ہے، یعنی انسان کا اپنے گناہ، غفلت اور کمزوری کا شعور۔ اقبال کے نزدیک جو شخص اپنے آپ سے غافل ہے، وہ زمانے کو نہیں بدل سکتا، خواہ اس کے نعرے کتنے ہی بلند ہوں۔ شاہین و چکور کے تقابل میں بھی اصل نکتہ یہی ہے کہ پرندے محض تمثیل ہیں، اصل مخاطب انسان ہے۔ اردو نظم "جوابِ شکوہ" میں ملت کی بیداری کا اعلان ہو یا فارسی پیامِ مشرق میں سحر کی آمد کا ذکر، ہر جگہ یہی صدا ہے کہ زندگی جاگنے والوں کا حق ہے۔ اس ربط کو بیان کرنے سے جواب ایک فہرست کے بجائے مربوط تجزیہ بن جاتا ہے۔

مزید وضاحت: علامات کو سمجھنے کا طریقہ

سوال نمبر 3: اقبال کی فارسی غزلوں کا فکری تجزیہ (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ اقبال کی فارسی غزلوں کا فکری تجزیہ پیش کیجیے۔ (20)

تعارف

غزل فارسی شاعری کی سب سے مقبول صنف ہے، مگر اقبال کی فارسی غزل روایتی غزل سے فکری اعتبار سے بہت مختلف ہے۔ روایتی غزل میں حسن و عشق، ہجر و وصال اور ساقی و شراب کے مضامین ذاتی و داخلی کیفیات تک محدود رہتے تھے، جبکہ اقبال نے غزل کے ہر شعر کو اپنی فکر، یعنی خودی، عشق، حرکت اور ملت کی بیداری، کا ترجمان بنا دیا۔ پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کی غزلیں اس فکری تجزیے کا اصل میدان ہیں۔ اس جواب میں ان غزلوں کے مرکزی افکار، ان کے باہمی ربط اور اقبال کے انفرادی مقام کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

خودی اور انسان کی عظمت

اقبال کی فارسی غزلوں کا پہلا بڑا فکری موضوع خودی ہے۔ ان غزلوں میں شاعر انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرتا ہے اور اسے یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ کائنات کا غلام نہیں، اس کا رازداں ہے۔ غزل کے اشعار عام طور پر ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں، مگر اقبال کے ہاں اکثر غزلوں میں خودی کا ایک مرکزی خیال اشعار کو باہم جوڑ دیتا ہے۔ وہ انسان کو خاک کا ذرہ ہونے کے باوجود آفتاب بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ فکر جدید انسان کے احساسِ کمتری کا علاج ہے اور غزل جیسی نازک صنف میں اس بھاری فلسفے کو سمونے سے اقبال کے فنی کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ نقادوں نے اسے غزل میں فلسفے کی کامیاب آمیزش قرار دیا ہے۔

عشق، حرکت اور بے قراری

دوسرا مرکزی فکر عشق اور اس سے پیدا ہونے والی حرکت و بے قراری ہے۔ اقبال کی غزلوں میں محبوب محض انسانی حسن نہیں، بلکہ ذاتِ الٰہی اور رسولِ اکرم کی ذاتِ گرامی ہے، اور عاشق وہ انسان ہے جو اس عشق میں اپنی خودی کو مکمل کرتا ہے۔ ان کے ہاں عشق کا کمال وصال کی آسودگی میں نہیں، فراق کی تڑپ اور مسلسل جستجو میں ہے، کیونکہ یہی تڑپ انسان کو آگے بڑھاتی ہے۔ ساحل کی زندگی کو انہوں نے موت اور موج کی بے قراری کو زندگی کہا ہے۔ اس فکری پہلو نے فارسی غزل کے اس پرانے رنگ کو بدل دیا جس میں عاشق ہجر میں گھلتا اور بے عمل رہتا تھا؛ اقبال کا عاشق مجاہد ہے جو میدانِ زندگی میں سرگرم رہتا ہے۔

ملت کی بیداری اور مغرب پر تنقید

تیسرا فکری موضوع ملتِ اسلامیہ کی بیداری اور مغرب کی مادی تہذیب پر تنقید ہے۔ اقبال کی غزلوں میں جہاں ذاتی کیفیات ہیں، وہیں اجتماعی درد بھی ہے؛ وہ مسلمان کی غفلت پر آنسو بھی بہاتے ہیں اور اسے اس کی عظمتِ رفتہ بھی یاد دلاتے ہیں۔ مغرب کے بارے میں ان کا رویہ دو رخا ہے: وہ اس کی علمی و سائنسی ترقی کے معترف ہیں، مگر اس کی روح سے خالی مادیت کو انسانیت کے لیے زہر سمجھتے ہیں۔ غزل کے اشعار میں یہ تنقید طنز و اشارے کے انداز میں آتی ہے، جس سے اس کی ادبی لطافت بھی برقرار رہتی ہے اور پیغام بھی پہنچ جاتا ہے۔ یہ خصوصیت اقبال کو خالص رومانی غزل گو شعراء سے الگ کرتی ہے اور انہیں مفکر شاعر بناتی ہے۔

فنی خصوصیات اور زبان

فکری تجزیے کے ساتھ اقبال کی فارسی غزلوں کی فنی خصوصیات بھی نمایاں ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی غزل کے اوزان، قافیوں اور ردیفوں کی پابندی کی، مگر تراکیب میں جدت پیدا کی اور نئی علامتیں، جیسے شاہین، خودی اور ساحل و موج، کو غزل میں داخل کیا۔ ان کی زبان میں حافظ کی غنائیت اور رومی کی فکری گہرائی کا امتزاج ملتا ہے۔ بعض غزلوں میں اشعار کا باہمی ربط، بعض میں مکالماتی انداز اور بعض میں خطیبانہ جوش پایا جاتا ہے۔ یہ تنوع بتاتا ہے کہ اقبال غزل کو ایک جامد قالب نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے ہر فکر کے لیے لچکدار ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کی غزلیں پڑھنے میں تازگی رکھتی ہیں اور ان پر لکھی گئی شرحیں آج بھی جاری ہیں۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اقبال کی فارسی غزلوں کا فکری تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غزل کو ذاتی جذبات کی صنف سے نکال کر فلسفہ، قوم اور انسانیت کی صنف بنا دیا۔ خودی، عشق، حرکت، بیداری اور مغرب پر تنقید ان غزلوں کے مرکزی افکار ہیں اور یہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اقبال کی انفرادیت یہ ہے کہ اس فکری بوجھ کے باوجود ان کی غزل کا حسن و کیف مجروح نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں فارسی غزل کا مجدد کہا جاتا ہے اور ان کی غزلیں آج بھی فکر و فن دونوں اعتبار سے زندہ ہیں۔

اقبال کی فارسی غزلوں کے فکری تجزیے میں ایک تنقیدی نکتہ بھی شامل کرنا چاہیے کہ بعض ناقدین نے ان غزلوں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ فکر کے بوجھ سے غزل کی نزاکت متاثر ہوتی ہے اور کہیں کہیں خطیبانہ لہجہ غزل کے داخلی کیف پر غالب آ جاتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب اقبال کے مدافعین یہ دیتے ہیں کہ اقبال نے غزل لکھی ہی اس لیے کہ وہ اس صنف کی مقبولیت کو پیغام کی ترسیل کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے، اور جس غزل میں پیغام اور کیف دونوں جمع ہو گئے ہیں، وہ فنی اعتبار سے بھی کامیاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی بہترین فارسی غزلیں وہی ہیں جہاں خودی و عشق کا فلسفہ اشعار کے حسن میں گھل مل گیا ہے، اور ایسی غزلوں کی تعداد کم نہیں۔ اس متوازن جائزے سے طالب علم کا جواب یک طرفہ تعریف کے بجائے سنجیدہ تنقید بن جاتا ہے، جو اعلیٰ نمبروں کے لیے ضروری ہے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی تجدید نے فارسی غزل کی تاریخ میں واقعی نیا باب کھولا۔

مزید وضاحت: تنقیدی جائزہ

ایک آخری نکتہ یہ ہے کہ اقبال کی فارسی غزل جدید دور کے قاری کے لیے اس لیے بھی پرکشش ہے کہ اس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا توازن ملتا ہے۔ آج کا انسان ایک طرف ذاتی سکون چاہتا ہے اور دوسری طرف اپنے معاشرے کی ذمہ داری بھی اس پر ہے۔ روایتی غزل اسے صرف پہلی دنیا دیتی تھی، جبکہ اقبال کی غزل اسے دونوں جہانوں کا راستہ دکھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان غزلوں کی شرحیں اور ان پر تحقیق کا سلسلہ ایران، افغانستان، تاجکستان اور برصغیر میں آج بھی جاری ہے اور نئے قاری ہر دور میں ان سے اپنے سوالوں کا جواب پاتے ہیں۔

مزید وضاحت: غزل اور جدید دور

سوال نمبر 4: "پیامِ مشرق" کی غزلیں اور دیگر فارسی مجموعے (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ "پیامِ مشرق" کی غزلیں اقبال کے دوسرے فارسی مجموعہ ہائے کلام سے مختلف ہیں، تائید یا تردید کیجیے۔ (20)

تعارف

یہ سوال اقبال کے فارسی مجموعوں کے تقابلی مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ پیامِ مشرق 1923ء میں شائع ہوا اور یہ اقبال کا پہلا بڑا فارسی مجموعہ ہے جو گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں لکھا گیا۔ دوسرے فارسی مجموعوں میں زبورِ عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اور ارمغانِ حجاز شامل ہیں، جبکہ اسرارِ خودی اور موزِ بے خودی مثنویات ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ پیامِ مشرق کی غزلیں دوسرے مجموعوں سے مختلف ہیں۔ اس جواب میں اس دعوے کی تائید و تردید دونوں پہلوؤں کو رکھ کر ایک متوازن نتیجہ پیش کیا جاتا ہے، کیونکہ ادبی تنقید میں یک طرفہ فیصلے کے بجائے دلائل کی روشنی میں رائے قائم کرنا زیادہ درست ہوتا ہے۔

تائید: پس منظر اور مخاطب کا فرق

تائید کا پہلا مؤقف یہ ہے کہ پیامِ مشرق کی غزلوں کا پس منظر اور مخاطب ہی الگ ہے۔ یہ کتاب مغرب کو مشرق کا جواب دینے کے لیے لکھی گئی، اس لیے اس کی غزلوں میں مشرق کی روحانی عظمت، مغرب کی مادی دوڑ پر تنقید اور دونوں تہذیبوں کا تقابل نمایاں ہے۔ اس میں حافظ کے رنگ کی غزلیں بھی ہیں اور ایسی نظمیں و غزلیں بھی جو یورپی مفکرین و شعراء سے مکالمہ کرتی ہیں۔ دوسرے مجموعوں، مثلاً زبورِ عجم، کا محور زیادہ تر انسان کی خودی اور ملت کی داخلی تعمیر ہے، جبکہ جاوید نامہ تمثیلی سفر ہے۔ یوں پیامِ مشرق کی غزلوں کا بین الاقوامی و تہذیبی پس منظر انہیں الگ مقام دیتا ہے اور اس حد تک دعویٰ درست معلوم ہوتا ہے۔

تائید: لہجے اور موضوعات کا فرق

دوسرا نکتہ لہجے کا ہے۔ پیامِ مشرق کی غزلوں میں نسبتاً نرمی، غنائیت اور حسن و کیف کا رنگ زیادہ ہے، کیونکہ اقبال یہاں مغرب کو مشرق کے حسن سے متعارف کرانا چاہتے تھے۔ اس میں فطرت کے مناظر، بہار، گل و بلبل اور عشق کی روایتی علامتیں کثرت سے آتی ہیں، اگرچہ ان میں بھی اقبال کا پیغام چھپا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں زبورِ عجم کی غزلوں میں فلسفیانہ شدت اور خطیبانہ جوش زیادہ ہے، اور ارمغانِ حجاز میں تو غزل کی کیفیت غالب ہے۔ اسی طرح پیامِ مشرق میں شامل بعض حصے، مثلاً یورپی شخصیات پر نظمیں، اسے ایک مخصوص علمی و ادبی دستاویز بنا دیتے ہیں جو دوسرے مجموعوں میں نہیں ملتی۔ ان اختلافات کی بنیاد پر بھی تائید کا پہلو مضبوط ہوتا ہے۔

تردید: فکری وحدت اور مشترک مرکز

تردید کا مؤقف یہ ہے کہ بنیادی فکر کے اعتبار سے پیامِ مشرق کی غزلیں دوسرے مجموعوں سے الگ نہیں، کیونکہ تمام مجموعوں کا مرکز ایک ہی ہے: خودی، عشق اور حرکت۔ پیامِ مشرق کی غزلوں میں بھی وہی انسان مخاطب ہے جو زبورِ عجم اور جاوید نامہ میں ہے، اور وہی مغرب پر تنقید ہے جو بعد کی کتابوں میں تفصیل سے آئی ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے بھی اقبال کی پہچان، یعنی نئی تراکیب، قرآنی اشارات، علامتی نظام اور جوشِ خطابت، ہر مجموعے میں مشترک ہے۔ مزید یہ کہ اقبال کی کتابیں ایک مسلسل فکری سفر کی کڑیاں ہیں؛ پیامِ مشرق اس سفر کا آغاز ہے اور بعد کی کتابیں اسی کی توسیع۔ اس زاویے سے دیکھیں تو اختلاف درجے اور پس منظر کا ہے، نوعیت کا نہیں، اور مطلق اختلاف کا دعویٰ درست نہیں ٹھہرتا۔

متوازن نتیجہ

دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر متوازن نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دعویٰ جزوی طور پر درست ہے۔ پیامِ مشرق کی غزلیں اپنے پس منظر، مخاطب، لہجے کی نرمی اور تہذیبی مکالمے کے اعتبار سے دوسرے فارسی مجموعوں سے نمایاں طور پر مختلف ہیں، اور یہ اختلاف اتنا واضح ہے کہ قاری پہلی قرأت میں محسوس کر لیتا ہے۔ تاہم فکر و اسلوب کی بنیادی وحدت کے اعتبار سے یہ اختلاف جدائی نہیں، تنوع ہے؛ ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں۔ تنقید کا اصول بھی یہی ہے کہ کسی مجموعے کی انفرادیت کو اس کی وحدت کے اندر دیکھا

جائے۔اس لیے مکمل تائید یا مکمل تردید کے بجائے یہ کہنا درست ہو گا کہ پیامِ مشرق کی غزلیں مختلف بھی ہیں اور اسی فکری خاندان کی فرد بھی ہیں جس کے دیگر افراد زبورِ عجم، جاوید نامہ اور ارمغانِ حجاز ہیں۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ پیامِ مشرق اقبال کے فارسی سفر کا نقطۂ آغاز ہونے کے ساتھ ایک منفرد دستاویز بھی ہے: یہ مغرب کے نام مشرق کا جواب ہے، اس لیے اس کی غزلوں کا رنگ، مخاطب اور لہجہ الگ ہے۔ لیکن جو طالب علم پوری فارسی شاعری پڑھے گا، وہ دیکھے گا کہ خودی و عشق کی جو شمع یہاں روشن ہوئی، وہی آگے کے مجموعوں میں مشعل بن گئی۔ اس تقابلی مطالعے کا فائدہ یہ ہے کہ طالب علم ہر مجموعے کو اس کے مقام پر رکھ کر پڑھنا سیکھتا ہے اور اقبال کی فکر کی تدریجی تکمیل کو سمجھتا ہے، جو اس کورس کا اصل مقصد ہے۔

اس تقابل کی ایک اور جہت زمانی بھی ہے۔ پیامِ مشرق اقبال کی فکری جوانی و پختگی کے درمیانی دور کی کتاب ہے، جب وہ مغرب سے واپسی کے بعد مشرق کو اس کی عظمت یاد دلا رہے تھے۔ بعد کے مجموعوں میں ان کا لہجہ بتدریج زیادہ دردمند اور زیادہ اندرونی ہوتا گیا؛ زبورِ عجم میں تصوفی سوالات سے مکالمہ ہے، جاوید نامہ میں آخرت و انسان کی تلاش ہے اور ارمغانِ حجاز میں زندگی بھر کی فکر کا خلاصہ ہے۔ اس زمانی سفر کو دیکھنے سے پیامِ مشرق کی غزلوں کی انفرادیت اور بھی واضح ہوتی ہے، کیونکہ وہ اس سفر کا وہ موڑ ہیں جہاں اقبال پہلی بار پوری خود اعتمادی کے ساتھ مغرب کے بالمقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جواب کا یہ رنگ حافظ سے ان کے والہانہ تعلق کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہے، کیونکہ گوئٹے نے بھی حافظ ہی سے مشرق کو جانا تھا۔ یوں پیامِ مشرق ایک ہی وقت میں حافظ کو خراج بھی ہے، گوئٹے کو جواب بھی اور نئی فارسی غزل کا اعلان بھی، اور یہی تہری حیثیت اسے دوسرے تمام مجموعوں سے الگ کرتی ہے۔

مزید وضاحت: تقابل کی ایک اور جہت

سوال نمبر 5: "ارمغانِ حجاز" کا مفصل تعارف (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ "ارمغانِ حجاز" کا مفصل تعارف پیش کیجیے۔ (20)

تعارف

ارمغانِ حجاز علامہ اقبال کا آخری شعری مجموعہ ہے جو ان کے انتقال کے بعد 1938ء میں شائع ہوا۔ ارمغان کے معنی تحفہ یا سوغات کے ہیں، اور حجاز سے مراد مکہ و مدینہ کی سرزمین ہے، اس لیے کتاب کے نام ہی سے اس کا مزاج واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حجازِ مقدس کی محبت و عقیدت کی سوغات ہے۔ اس مجموعے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں کا کلام شامل ہے۔ اقبال زندگی میں حج کی سعادت حاصل نہ کر سکے، مگر ان کے دل میں حرمین کی محبت اس قدر تھی کہ یہ کتاب ان کی اسی آرزو و عقیدت کا اظہار بن گئی۔ اس جواب میں کتاب کا پس منظر، حصے، موضوعات اور خصوصیات کا مفصل تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

پس منظر اور اشاعت

ارمغانِ حجاز کی نظمیں اقبال نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں کہیں، جب ان کی صحت کمزور ہو چکی تھی اور ان کی فکر پوری طرح پختہ ہو چکی تھی۔ یہ وہ دور ہے جب انہوں نے ملت کے مسائل پر گہری نظر ڈالی اور سیاست و تہذیب پر حتمی آراء قائم کیں۔ کتاب اقبال کی وفات کے بعد ان کے احباب و شاگردوں کی کوشش سے شائع ہوئی۔ اس میں فارسی حصہ خاصا اہم ہے جس میں رباعیات اور نظمیں شامل ہیں، اور اردو حصے میں بھی وہی افکار ہیں جو ان کی پوری شاعری کا حاصل ہیں۔ کتاب کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ اقبال کی فکر کا آخری بیان ہے؛ جو موقف انہوں نے ساری عمر اختیار کیا، وہ یہاں خلاصے کی صورت میں مل جاتا ہے۔

موضوعات و مضامین

ارمغانِ حجاز کے بڑے موضوعات میں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سرِ فہرست ہے۔ اقبال کے نزدیک مسلمان کی خودی کا مرکز و محور ذاتِ رسالت مآب ہے، اور اس کتاب میں یہ عقیدت اپنی پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے۔ دوسرا موضوع حج و حرمین سے والہانہ محبت اور اس کی آرزو ہے جو اقبال کے دل میں عمر بھر رہی۔ تیسرا موضوع ملتِ اسلامیہ کی حالت پر دردمندانہ تنقید اور اس کی اصلاح کی دعوت ہے؛ وہ یہاں بھی نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہیں۔ چوتھا موضوع مغربی سیاست و تہذیب پر سخت تنقید ہے، خصوصاً اس دوغلے پن پر جو اقوام کو غلام بناتا ہے۔ اس کے ساتھ خودی، فقر، عشق اور سوز و حیات جیسے ان کے دائمی موضوعات بھی پختہ ترین صورت میں یہاں موجود ہیں، اس لیے یہ کتاب اقبال شناسی کا ایک مکمل باب ہے۔

فارسی حصے کی خصوصیات

ارمغانِ حجاز کے فارسی حصے میں رباعی کو خاص مقام حاصل ہے۔ رباعی مختصر صنف ہے، مگر اقبال نے اس میں بڑے بڑے فلسفیانہ نکات سموئے ہیں؛ ہر رباعی گویا ان کی فکر کا ایک موتی ہے۔ فارسی نظموں میں بھی وہی جوش، تراکیب اور علامتیں ہیں جو ان کے سابقہ فارسی کلام کی پہچان ہیں، مگر یہاں لہجے میں زندگی بھر کے تجربے کی پختگی اور ایک خاص قسم کی دردمندی آ گئی ہے۔ بعض فارسی نظموں میں وہ حجاز کی فضا، کعبہ و مدینہ کی محبت اور امت کے درد کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری خود کو اسی کیفیت میں شریک محسوس کرتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے یہ کلام سادہ بھی ہے اور پراثر بھی، کیونکہ بڑے شاعر کا آخری کلام عام طور پر تصنع سے پاک ہوتا ہے۔

ادبی و فکری اہمیت

ارمغانِ حجاز کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ یہ اردو و فارسی شاعری کے درمیان پل کی حیثیت رکھتی ہے؛ ایک ہی مفکر دو زبانوں میں ایک ہی پیغام دے رہا ہے، جس سے اس کی دو لسانی وحدتِ فکر کا ثبوت ملتا ہے۔ فکری اعتبار سے یہ کتاب اقبال کے اس اصول کی آخری مہر ہے کہ مسلمان کی نجات عشقِ رسول، خودی کی تعمیر اور مغربی غلامی سے

آزادی میں ہے۔ادبی اعتبار سے اس کی رباعیات فارسی وار دو رباعی کی روایت میں اہم اضافہ ہیں۔ناقدین اس کتاب کو اقبال کی وصیت سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ اس میں ان کی تمام عمر کی فکر و آرزو کا نچوڑ آگیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اقبال کے مطالعے کا اختتام عام طور پر اسی کتاب پر کیا جاتا ہے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ارمغانِ حجاز اقبال کا آخری شعری تحفہ ہے جو عشقِ رسول، حرمین، ملت کے درد اور خودی کے پیغام سے بھرپور ہے۔فارسی وار دو دونوں حصوں پر مشتمل یہ کتاب اقبال کی فکر کا خلاصہ بھی ہے اور ان کی عقیدت کا اظہار بھی۔طالب علم کے لیے اس کا مطالعہ اس لیے ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر اقبال کی فارسی شاعری کا سفر نامکمل رہتا ہے؛ پیامِ مشرق سے شروع ہونے والا سفر ارمغانِ حجاز پر اپنے انجام کو پہنچتا ہے، اور اس انجام کو دیکھ کر پورا سفر ایک نظر میں سمجھ آجاتا ہے۔

مزید وضاحت: کتاب کا مطالعہ کیوں ضروری ہے

ارمغانِ حجاز کے تعارف کو مکمل کرنے کے لیے یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ طالب علم کو اقبال کے آخری دور کے ذہنی ارتقا سے روشناس کراتا ہے۔اس دور میں اقبال بیماری اور کمزوری کے باوجود ملت کے مستقبل سے مایوس نہیں تھے؛ ان کا کلام بتاتا ہے کہ انہیں نوجوان نسل سے آخری دم تک امید رہی۔کتاب کی بعض نظموں میں انہوں نے اپنے بعد آنے والوں کو گویا وصیت کی ہے کہ وہ ان کے پیغام کو آگے بڑھائیں۔اسی لیے اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قاری کو شاعری کے ساتھ ایک بزرگ کی آخری گفتگو سننے کا احساس ہوتا ہے۔ناقدین نے اس کتاب کی سادگی کو اس کی سب سے بڑی خوبی کہا ہے، کیونکہ یہاں اقبال فلسفے کو مشکل اصطلاحات کے بجائے دل کی زبان میں بیان کرتے ہیں۔فارسی رباعیات کی پختگی اور اردو حصے کی دردمندی مل کر اس کتاب کو اقبال کے کلام کا بہترین تعارفی مجموعہ بھی بناتی ہیں؛ جو قاری اقبال کو پہلی بار پڑھنا چاہے، اس کے لیے بھی اور جو آخری بار خلاصہ چاہے، اس کے لیے بھی یہ کتاب یکساں مفید ہے۔